Fikr-o-Nasar (Islamabad) 25:3 (1988)

غالب

مدح و قدح کی روشنی میں

تبصرہ : ڈاکٹر خورشید رضوی

ابن خلکان نے ابوالفرج الاصبہانی کے بارے میں کہا تھا:

,,وله شعر يجمع اتقان العلماء و احسان الظرفاء الشعراء،،

,,اسکی شاعری میں علماء کی سی پختگی اور نکتہ داں شعرا کی سی جودت یکجا ہے،،

تحقیق اور تخلیق، علم اور ادب واقعی کسی ایک ذات میں مشکل سے جمع ہوتے ہیں ۔ برصغیر پاک و ہند میں علامہ شبلی نعمانی اس گروہ کمیاب کے نمائندہ ہیں ۔ وہ اعلی درجے کے عالم اور بلند پایہ محقق ہی نہ تھے ایک نغز گو شاعر اور ژرف بیں نقاد بھی تھے ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کو یہ روایت ورثے میں ملی اور سید سلیمان ندوی اور شاہ معین الدین احمد سے ہوتی ہوئی سید صباح الدین عبدالرحمن تک پہنچی چنانچہ انھوں نے متعدد عالمانہ و محققانہ موضوعات کے پہلو بہ پہلو غالب اور خسرو پر بھی قلم اٹھایا ۔

,,غالب مدح و قدح کی روشنی میں،، کی دو ضخیم جلدیں ہمارے سامنے ہیں جو سلسلہ دارالمصنفین کے نمبر ۱۲۷ اور ۱۳۰ کے تحت یکے بعد دیگرے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئیں ۔ پہلی جلد میں مرزا غالب کی زندگی سے لے کر ۱۹۲۸ء تک اور دوسری جلد میں ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک (جب برصغیر میں غالب کا صد سالہ یادگار سیمینار منعقد کیا گیا)، غالب کی حمایت و مخالفت میں لکھی جانے والی تحریروں پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے ۔

اس تالیف کی اولین تحریک ۱۹۶۸ء میں جناب سیماب اکبر آبادی کے صاحبزادے اور ,,شاعر،، کے ایڈیٹر جناب اعجاز صدیقی صاحب کی طرف سے ہوئی جسے گورنر یو ۔ پی جناب بی ۔ گوپالا ریڈی کے اظہار دل چسپی سے مزید تقویت ملی ۔ ,,معارف،، میں اس کا کچھ حصہ شائع ہوا تو جناب رشید احمد صدیقی نے اس میں خصوصی دل چسپی کا اظہار فرمایا اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت پر زور دیا ۔ ان کا خیال تھا کہ اس کتاب کی تکمیل سے یونیورسٹیوں میں غالب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی اور یہ ,,اقبال کامل،، کی طرح مقبول ہو گی ۔ شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج سے سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی ریٹائرمنٹ پر یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے انھیں اردو ادب پر تحقیق کے سلسلے میں وظیفہ دیا جس کے لئے اس موضوع کی باقاعدہ منظوری عمل میں آ گئی ۔ اور اس وسیلے سے بالآخر یہ دونوں ضخیم جلدیں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئیں ۔

بنیادی طور پر اگرچہ یہ کام تالیفی نوعیت کا تھا جس میں بہت سی پرانی تحریروں کو یکجا کرنا تھا ۔ تاہم، خود سید صباح الدین صاحب کے بقول، پرانی شراب کو نئے مینا و ساغر میں انڈیلنا بھی ایک بڑا فن ہے ۔ اکثر پرانی تحریریں نگاہوں سے یوں اوجھل اور حافظوں سے یوں محو ہو جاتی ہیں کہ ان کی بازیافت، نظارہ اولین سے کم سرور انگیز نہیں ہوتی ۔ چنانچہ مرزا کے معاصرین میں سے میر محمد خاں سرور، مصطفی خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین نیر، مولوی کریم الدین، سر سید احمد خان، امام بخش صہبائی، غلام غوث بیخبر، مولانا فضل حق، غلام علی وحشت، سید غوث علی قلندر، نواب جاورہ غوث محمد خاں بہادر، امجد سندیلوی، عزیز لکھنوی وغیرہ نے غالب کے بارے میں جو کچھ کہا وہ ریکارڈ

پر یقیناً موجود ہے لیکن بہت سے قارئین پر یہ سارا مواد پہلی بار سید صباح الدین عبدالرحمن ھی کی محنت سے منکشف ہوا ۔ بلکہ جو اھل نظر اس مواد کی لخت لخت تفصیلات سے واقف بھی تھے ان کے لئے بھی اس کا یــوں مرتب صورت میں یکجا سامنے آنا بصیـرت افروزی سے خالی نہ تھا ۔ کیونکہ اس سے موضوع کے تناظر میں ایک نیا عمق پیدا ہوا ۔ یہ منتشر معلومات الگ الگ بھی آئینوں کی طرح لو دیتی تھیں ۔ لیکن آئینہ خانے میں عکس در عکس کا جو طلسم پیدا ہوتا ہے الگ الگ آئینوں میں اسکا ظہور ممکن نہیں ۔ کسی نے درست کہا ہے کہ کُل اپنے اجزاء کے مجموعے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے ۔

پھر سید صباح الدین صاحب کی یہ کوشش تــالیف محض بھی نہیں انھوں نے غالب شناسی اور غالب شکنی کی منتشر دستاویزات کی بہـم آوری اور تنسـیق و ترتیب ھی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جا بجا ذاتی محاکمہ شامل کر کے ,,تنقیدوں پر تنقید اور تبصروں پر تبصرہ،، بھـی فـرمایا ہے ۔ اس تبـصرہ و محــاکمہ سے اختلافِ رائے تو ممکن ہے لیکن اسکی اھمیت سے انکار ممکن نہیں ۔ بلکہ نگاہ غور سے دیکھیں تو یہ کتاب اختلافِ رائے ھی کا احترام سکھاتی ہے ۔ سید صاحب نے غالب کی مدح اور قدح دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دے کر بین السطور اس احترام ھی کا سبق دیا ہے جو اختلافِ علمی کی آب و ھوا کو معتدل رکھنے کے لئے ضروری ہے اور اختلافِ ذاتی سے بہت بالاتر ہے ۔

رشید احمد صدیقی صاحب سے سید صباح الدین کی محبت انکی تحریر میں جا بجا جھلکتی ہے ۔ دونوں جلدوں کے دیباچے میں انھیں بطور خاص یاد کیا گیا ہے کہ انھی کی ذات اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں سب سے بڑا محرک تھی مگر وہ اپنی آنکھوں سے اسکی

تکمیل نہ دیکھ سکے ۔ تاہم بطور نقاد ان کی آراء پر بھی سید صاحب کا محاکمہ نہایت معروضی ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

,,... رشید صاحب نے اس مضمون میں اپنی کچھ ایسی رائیں بھی ظاہر کی ہیں جن سے ان کی کیف و نشاط سے بھری ہوئی تحریروں کے بعض مداحوں کو اتفاق کرنے میں تامّل ہوگا،، (جلد دوم ص ۲۱۴)

اسکے بعد ان اختلافی آراء کی مثالیں دی ہیں اور ان پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے ۔ محبت و احترام سے پُر، کچھ ایسا ہی اختلاف خود سید صاحب کی بعض آراء سے بھی کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً جلد اول میں صفحہ ۳۰ تا ۳۴ ,,اپنی مذمت آپ،، کے عنوان سے غالب کے جو اقتباسات مہیا کئے گئے ہیں ان سے ,,اپنی مذمت آپ،، کا استنباط کرنا محل نظر ہے ۔ یہ تحریریں تو ایک لطیف اسلوب میں ,,شکایتِ زمانہ،، پر مشتمل ہیں اور جو چیز بظاہر ,,خود مذمتی،، دکھائی دیتی ہے درحقیقت اسے ,,مدح بمایشبہ الذم،، کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔

اسی بحث میں ذرا آگے چل کر (ص ۳۹) ,,اپنی اردو شاعری کی تحقیر،، کا عنوان قائم کیا گیا ہے اور بطور استشہاد یہ دو شعر پیش کئے گئے ہیں جن سے یہ نتیجہ برآمد کرنے میں بہت سے قارئین کو تامّل ہو سکتا ہے :

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کُھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

اسی طرح کا ایک استنباط یہ ہے :

,,وہ اپنی ناداری کو دور کرنے کے لئے دست سوال بھی دراز کر دیا

کرتے تھے جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے :

بنا کے فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں،،
(جلد اول ص ۷۷)

اس سے ذرا پہلے (جلد اول ص ۷٦) غالب کے ,,چنا جان نہ سہی منا جان سہی،، والے خط کا کچھ حصہ جس سیاق و سباق میں نقل کیا گیا ہے خط کے پس منظر کو نظر میں رکھتے ہوئے یہاں اس کا اقتباس بھی محلّ نظر معلوم ہوتا ہے۔

تاہم یہ یا ایسی ہی چند اور مثالیں جنھیں زاویہ نگاہ کے اختلاف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے سید صاحب کے ان خوبصورت ناقدانہ محاکمات کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں کر سکتیں جو جا بجا اس تالیف کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مثلاً حالی کے مرثیہ غالب اور آب حیات میں محمد حسین آزاد کے قلم سے استاد ذوق کی مدح و توصیف کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

,,حالی اور آزاد نے اپنے اپنے استاد کی مدح میں جو کچھ لکھا ہے ان دونوں میں مبالغے کا رنگ ضرور آ گیا ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ آزاد نے اپنی نثر میں شاعری کی ہے اور حالی نے شاعری میں شاعری کی ہے۔ شاعری کے لئے مبالغہ بعض اوقات تو حسن اور زیور بن جاتا ہے لیکن یہ بات کسی بھی نثر کے لئے نہیں کہی جا سکتی،، (جلد اول ص ۷۳)

غالب اور آزاد کے محاکمے میں سید صاحب کا یہ کلامِ منصفانہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ :

,,آزاد نے اپنے استاد کی جو مدح سرائی کی ہے اس سے غالب کے پرستار خواہ کتنے ہی آرزدہ ہوں لیکن اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ غالب کی شخصیت اور ان کی

شاعری کے روشن پہلوؤں کو باضابطہ تحریر میں لانے کی اوّلیت آزاد ھی کو حاصل ہے۔ (جلد اول ص ٦۳) .

اسی طرح حالی کی ,,یاد گار غالب،، کے سلسلے میں یہ اہم نکتہ :

,,.... اس میں حالی کے دل نشین طرز ادا کو بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے اپنے قلم کے آرٹ سے غالب کی کمزوریوں کی طرف پڑھنے والے کا ذھن تو ضرور متوجہ کر دیا لیکن ان کی کمزوریوں سے متاثر نہیں ہونے دیا ... ،، (جلد اول ص ۷۹)

انگریزوں کی خوشامد کا طعن جو غالب پر اکثر کیا جاتا ہے اس کے جواب میں سید صاحب کا یہ تبصرہ کس قدر حقیقت پسندانہ ہے :

,,اور پھر غالب کیا پورا ھندوستان انگریزوں کے سیاسی چوگان کا گیند بن گیا ۔ انگریزوں کے دربار کے ایک گیند بننے کی شکایت غالب سے ہے تو پورے ھندوستان سے بھی ہونا چاھئے اور اگر ھندوستان سے نہیں ہے تو پھر خستہ جان، پریشان حال، مقروض، آشفتہ نوا، ستم ھائے روزگار کو برداشت کرنے والے اور زمانے کے مارے ہوئے اسد اللہ خاں غالب سے بھی نہیں ہونا چاھئے ۔ اس وقت کا ھندوستان اپنی زبان حال سے غالب کے لئے یہی کہہ رہا تھا ع

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(جلد اول، ص ۱۸۱)

جلد دوم میں آل احمد سرور صاحب کے اسلوب تنقید پر (ص ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۹) اور سید احتشام حسین صاحب کے اشتراکی تخیل پر (ص ۲۰٦) تبصرہ بھی بھر پور اور کاٹ دار ہے۔

ھر چند سید صاحب نے کتاب کی حدود متعین کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ,,.... ہم غالب کی اردو شاعری کی مدح و قدح پر زیادہ

زور دینا چاهتے هیں ۔ ان کی فارسی شاعری اور نثر پر صرف سرسری جائزہ لینے پر اکتفاء کرتے هیں،، (جلد اول ص ۹۱) تاهم اس کتاب میں جسو مباحث سرسری طور پر آئے هیں وہ بھی خاصے جامع هیں ۔ غالب سے متعلق مختلف موضوعات پر بہت سی طویل کتابوں کا نچوڑ جا بجا نہایت اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ صفحات کے حوالے بھی قوسین میں مہیا کر دیئے گئے هیں ۔ مثال کے طور پر جلد اول ص ۲۱۱ ۔ ۲۱۲ پر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے مشہور مقالے کی تلخیص ۔ اسی طرح ص ۱۵۱ ۔ ۱۵۲ پر غالب کے رنگ تغزل کا تجزیہ کرتے هوئے اس کے کلام سے ان کلیدی الفاظ و تراکیب کا انتخاب جو اس کے هاں تصورات کی بو قلمونی و گونا گونی کو ظاهر کرتے هیں ۔ یا جلد دوم میں صفحہ ۱۲۴ و مابعد پر مولانا عرشی رام پوری کی کتاب ,,سرگزشت غالب،، کا اور صفحہ ۲۹۵ پر ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون کا خلاصہ ۔ یا اسی جلد میں صفحہ ۱۳۰ ۔ ۱۳۱ پر عرشی صاحب کے اور صفحہ ۱۴۱ پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے حوالے سے غالب کے املاء اور رموز و اوقاف کا جائزہ ۔ اس ضمن میں جلد دوم صفحہ ۷۰ تا ۸۸ پر غالب کے سوانح زندگی کا خلاصہ باعتبار سنین جو مختلف مصادر سے بہم پہنچایا گیا ہے نیز صفحہ ۱۵٦ و مابعد پر دیوان غالب کی مختلف اشاعتوں سے متعلق معلومات بھی مؤلّف کی عرق ریزی کا پتہ دیتی هیں ۔ بعض مضامین شعری کے سلسلے میں غالب کے حوالے سے دیگر اساتذہ کے کلام کا ایک انتخاب جا بجا پیش کیا گیا ہے جو متفرق دواوین کے بالاستیعاب مطالعے کے بغیر ممکن نہ تھا (مثال کے طور پر دیکھئے جلد اول، ص ۱۴۱ تا ۱۴۳، ۱۴٦، ۱۴۷) ۔ غالب کے بیسیوں اشعار کی تشریح اور اس ضمن میں مختلف شارحین کے ارشادات کا موازنہ بھی وسیع مطالعے کا نچوڑ پیش کرتا ہے ۔

جلد دوم صفحہ ۱۴۴ پر مالک رام کی سابقہ ذوق پرستی، صفحہ ۲۵۷ پر نثار علی شہرت کی روایت بسلسلہ ملاقاتِ غالب ـــ (جس کی تفصیلات پر فی الفور یقین کرنے میں شاید بہت سے قارئین کو تامّل ہو) ـــ اور صفحہ ۲۶۱ ، ۲۶۲ پر ملک الشعراء بہار کی رائے، ایسے نادر نکات پر مشتمل ہیں جو آسانی سے ہاتھ نہیں آتے ۔

سید صاحب کی ایک قابل ذکر رائے جس کا اظہار انھوں نے اس کتاب میں بار بار کیا ہے یہ ہے کہ غالب کی عظمت ان کے منتخب مطبوعہ کلام ہی پر قائم ہے۔ ان کا رد کیا ہوا غیر مطبوعہ کلام ڈھونڈ ڈھانڈ کر شائع کرنا ان کے نزدیک ایک نامناسب رویہ ہے فرماتے ہیں :

,,یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ میر کا سارا کلام چھپ کر سامنے آیا تو اب ان کا انتخاب شائع کیا جا رہا ہے لیکن غالب نے اپنا منتخب کلام پیش کیا تو ان کے سارے کلام کی جستجو جاری ہے،، (جلد اول ص ۱۸۷)

,,... لیکن آئندہ ان کے پراگندہ، مغلق، مشکل، اور نظری کلام کو اکٹھا کر کے ان کا کوئی ضخیم دیوان لوگوں کے سامنے پیش ہوا اور اسکے مطالعے پر اصرار کیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ غالب کی وہ مقبولیت باقی نہ رہے جو آج ان کو حاصل ہے،، (جلد دوم ص ۲۹۹)

الغرض سید صباح الدین عبدالرحمن کی یہ تالیف اپنے حجم سے کہیں زیادہ متنوع معلومات کا ذخیرہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور غالبیات کے کتب خانے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ سید صاحب نے اس میں غالب کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری جیسے پرجوش مادحین اور یگانہ، آرگس ، اور ڈاکٹر عبداللطیف جیسے قادحین کو یکساں فراخ دلی کے ساتھ پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے ـــ (غالب کے ہم عصر میر محمد خاں سرور سے لے کر ڈاکٹر عبادت

بریلوی تک تقریباً ۷۵ شخصیات کی دور بدور مدح و قدح زیر بحث لائی گئی ہے) ـــ اور خود ایک منصف مزاج ناقد کی طرح دونوں پر بے لاگ نقد و تبصرہ کیا ہے اور ہر ایک کو اس کا حق دینے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر عبداللطیف کی غالب شکن آراء کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں ان پر تنقید کی ہے وہاں غالبیات کے میدان میں ان کی ایک خاص عطا کا ذکر بھی ضروری سمجھا ہے :

,,... البتہ ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنی کتاب میں دو ایسی نئی باتوں کی طرف متوجہ کیا جن کی طرف غالب کے سوانح نگاروں اور نقادوں کا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا ۔ ایک تو یہ کہ ان کی زندگی کے واقعات تاریخ وار اور ترقی وار بیان کئے جائیں دوسری یہ کہ ان کے کلام کی ترتیب بھی سنین وار دی جائے تاکہ ان کے ذہن و کمال کے نشوونما اور ارتقاء پر روشنی پڑے ۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ دونوں باتیں غالبیات کے حلقہ میں سنی گئیں،، (جلد اول ص ۳۳۹)

دوسری جلد کے آخر میں صفحہ ۳۸۷ تا ۳۹۷ ایک تتمہ لکھا ہے جس میں پوری کتاب کے مباحث کی ایک مختصر باز گشت پیش کی ہے ۔ کتاب میں اغلاط کتابت جن پر دونوں جلدوں کے دیباچے میں مولّف نے اظہارِ تاسّف کیا ہے واقعی افسوسناک حد تک کثرت سے پائی جاتی ہیں ۔ ایک اور کمی یہ محسوس ہوتی ہے کہ ہر چند مختلف مباحث کے دوران قوسین میں مآخذ کے صفحات کے حوالے دے دیئے گئے ہیں لیکن آخر کتاب میں کوئی مرتب ,,فہرست مآخذ،، مہیا نہیں کی گئی جس سے یہ تمام مآخذ بیک نگاہ سامنے آ سکیں نیز یہ معلوم ہو سکے کہ مولّف کے استعمال میں ان کے کون سے ایڈیشن رہے تھے ۔ لیکن یہ کمی ایسی نہیں جس کے لئے ایک معروف صاحب قلم لازماً خود ہی اپنا قیمتی وقت صرف کرے ۔ یہ کام مولّف مرحوم کے تلامذہ بخوبی انجام دے سکتے ہیں ۔

●●●